

بہار پاکستان

05-21-2017



فہرست

بچوں کی دنیا

۱. بھوت.....
۲. خواتین کا عالمی دن.....
۳. میرے وطن کے پھولو ہمیشہ کھلتے رہو.....

معاشرہ اور ثقافت

۵. انٹرنیشنل چلڈرن بک ڈے!.....
۷. بہتر گھر.....
۸. ہائے میرا بچپن!!!!.....

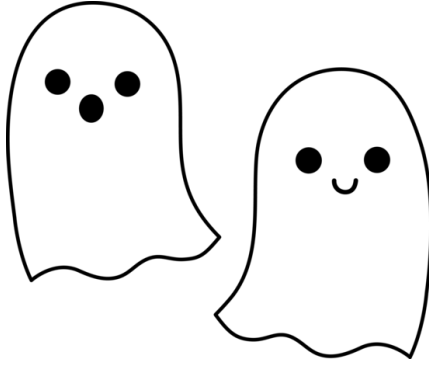
بھوت

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

اکثر سردیوں میں اسی طرح گزارہ کرتے تھے، اس دوران میں ایک کبوتر نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ کیا کچرے کے ڈھیر پر کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، جواب میں کبوتر کو بتایا گیا کہ نہیں، وہاں صرف ایک مردہ پرندے کو پھینکا گیا ہے۔

رات گئے گرجا گھر کی چھت پر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مذہبی رسومات کے انچارج کوئے نے کہا کہ گرجا گھر کے کنکرے مدتوں سے موسم سرما کی شدت برداشت کر رہے ہیں، بر فباری اور کھرے کے سبب ان کی حالت خراب ہے، شاید کوئی حصہ ٹوٹ گیا ہو۔ اگلی صبح گم شدہ روح کا مجسمہ اپنی جگہ موجود نہ پا کر کبوتروں نے اطمینان کا سانس لیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں کسی اور فرشتے کا مجسمہ نصب کیا جائے گا، گم شدہ روح کے مجسمے کو کسی نے ٹوڑ کر باہر پھینک دیا تھا۔

یہ واحد محفوظ پناہ گاہ تھی اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، روزانہ وقفے وقفے سے مجسمے کے اوپر بیٹھتا، کبھی قریبی ستون پر چڑھ جاتا اور مجسمے کی محبت اور پناہ دینے کے لیے شکریہ کے طور پر گیت گاتا رہتا۔ یہ بد صورت پتھر کے لیے خوشی کے دن تھے کیونکہ اس کا مہمان پرندہ روزانہ وہاں چبکتا، ہر روز سریلی آواز میں گیت گاتا، شام کو گرجا گھر کی گھنٹی بجتی تو چگاڑو دینگے ہوئے آہستگی سے اپنے گھروں سے نکل آتے اور پرندہ گیت گاتا رہتا۔



یہ موسم کی تبدیلی تھی یا طوفانی بارشوں کا اثر یا کوئی وجہ تھی کہ بد صورت پتھر کی سختی اور اس کی شکل میں خوشگوار تبدیلی آ رہی تھی۔ گرجا گھر کی چھت پر خوبصورت نئے سناتے پرندے کی آواز سب کو پسند تھی مگر وہ اس پر افسوس کرتے یہ آواز ہمیشہ رہنے والی نہیں، یہ خوبصورت گیت ختم ہو جائیں گے اور گرجا گھر کی دیواریں معصوم پرندے کو بھول جائیں گی۔ گرجا گھر کے مکینوں نے، ایک دن معصوم پرندے کو پنجرے میں قید کر کے گرجا گھر کے باہر فروخت کرنے کے لیے رکھ دیا تاکہ کچھ معاشی فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ وہ رات معصوم پرندے پر بہت بھاری تھی، جو اس نے اپنے ٹھکانے سے دور گزاری۔ بد صورت پتھر پریشان ہوا کہ پرندہ واپس کیوں نہیں آیا، اس نے سوچا شاید اسے بلی کھا گئی ہے یا پھر کسی نے پتھر مار کے زخمی کر دیا ہے، مہمان پرندے کے بغیر گم شدہ روح کے بد صورت مجسمے کو پہلی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔

صبح سویرے جب گرجا گھر کی چڑیوں کا شور اٹھا اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہوئی تو اسے معصوم پرندہ بہت یاد آیا، جب کبوتر گرجا گھر کو اونچی دیواروں کے کنکروں پر بیٹھتے اور چڑیاں چبکتیں تو اس کے کانوں میں معصوم پرندے کے گیت گونجنے لگتے۔

گم شدہ روح کا مجسمہ بہت اُداس اور غمزدہ تھا۔ کبوتر کھاتے وقت ہمیشہ اس معصوم پرندے کا ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ شدید سردی کے ایک دن اور کبوتر چڑیوں کے ساتھ گرجا گھر کی چھت خوراک کے لیے پریشان بیٹھے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی اپنا بچا ہوا کھانا چھت پر پھینکے تاکہ ان کی بھوک مٹ سکے، وہ

قدیم گرجا گھر کی اونچی اونچی دیواروں پر بہت سے تراشیدہ پتھر رکھے ہوئے، ان میں سے کچھ فرشتوں کے مجسمے تھے، کچھ پادریوں اور بادشاہوں کے اور کچھ پاکیزہ شخصیات کے۔ گرجا گھر کے ایک کونے میں ایک بدرنگ اور بے ڈھنگا پتھر پڑا تھا، جس پر نہ کوئی تاج بنا ہوا تھا، نہ ہی اس کی کوئی شکل و صورت سمجھ آ رہی تھی۔ گرجا گھر میں رہنے والے موٹے نیلے کبوتروں نے سمجھا کہ شاید کوئی بھوت ہے مگر مذہبی رسومات کے انچارج کوئے نے انہیں بتایا کہ یہ ایک گم شدہ روح ہے۔ سردیوں کا کوئی دن تھا، گرجا گھر کے چھت پر ایک سریلی آواز والے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، جو سخت سردی کے باعث دھوپ تلاش کرتا ہوا گرجا گھر کی باڑ پر آ بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معصوم پرندہ ایک فرشتے کے مجسمے پر آ بیٹھا، وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہاں گھونسا بنالے۔



گرجا گھر میں موجود چڑیوں اور کبوتروں نے اسے وہاں رہنے سے روک دیا اور اس قدر شور مچایا کہ اسے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ معصوم پرندہ وہاں سے اڑ کر، گم شدہ روح کی تصویر والے بد صورت پتھر پر جا بیٹھا اور اسے ہی پناہ گاہ بنالیا۔ گرجا گھر کے کبوتر اس پتھر کو محفوظ جگہ نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ ایک تو وہ گمنام سے کونے میں پڑا تھا دوسرا اس پر ہر وقت گہرا سایہ موجود رہتا تھا۔ گم شدہ روح کا مجسمہ اگرچہ بدرنگ تھا اور اس کے بازو اس طرح کھلے ہوئے بنے تھے جیسے وہ اپنے دشمن کو لٹا رہا ہو، لیکن اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی، معصوم پرندہ وہیں رہنے لگا۔ وہ روزانہ خاموش مجسمے کے اوپر چڑھ جاتا اور خوابوں میں کھوئے دوسرے مجسموں کو دیکھتا رہتا، معصوم اور کمزور پرندے کے لیے

خواتین کا عالمی دن

مصنف: علی احمد



بیروکار عورت کو عزت دینے میں اتنے بخیل کیوں؟ اسی پاکستان میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر تھا آج بھی اس معاشرے میں جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہیں اسے ورثت میں حصے سے محروم رکھا جاتا ہے تو کہیں غیرت کے نام پر اس کا خون بہایا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کے کچھ منفی اور کچھ مثبت پہلو ہوا کرتے ہیں۔ مرد چاہے مغربی معاشرے کا ہو یا مشرقی معاشرے کا اگر اس کی سوچ مثبت اور تعمیری ہو۔ اگر وہ اخلاقیات کے اعلیٰ درجہ پر ہو تو وہ عورت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ یہ اس کی تربیت ہے جو اسے عورت کی عزت کرنا سکھاتی ہے۔ اور مرد کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہو کر خاندان کے ماحول سے ہوتی ہوئی معاشرے کے طور طریقوں پر ختم ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کے مالک لوگ نہ صرف عورت کو عزت دیتے ہیں بلکہ انہیں خاندان اور معاشرے کا نہایت اہم رکن کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں وہ اپنی ماں، بیوی اور بہن اور بیٹی ان سارے حوالوں سے عورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر معاشرے کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی روشن مثالوں کو بیان کریں تو اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے جدوجہد آزادی میں سرگرم رہنے والی خاتون ”فاطمہ جناح مارو ملت“ کہلائیں۔ معاشرے کی فلاح اور رہنمائی کا بیڑا سر پر اٹھائے ہوئے دن رات مصروف عمل رہنے والی بلیقیں ایدھی ایک منفرد اور اعلیٰ سوچ رکھنے والے عظیم انسان کی بیوی ہے۔



ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھنے والی عظیم ادیبہ بانو قدسیہ کو بھی اشفاق احمد جیسے اعلیٰ پایے کے محقق اور مدبر انسان کی معاونت حاصل رہی۔ انوار پاکستان میں بھرتی ہونے والی خواتین جو اپنی زندگی داؤ پر لگا کر فرض کی تکمیل کے لیے ہر روز ڈیوٹی پر موجود ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک فلائنگ آفیسر مریم مختیار اس وطن عزیز کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والی باہمت بیٹی کا جنم بھی تو اسی معاشرے میں ہوا تھا۔ اناک اور نیوکلیر فنرکس میں مہارت رکھنے والی اس قوم کی غیور ”بیٹی“ ڈاکٹر عافیہ صدیقی، بھی تو کسی باپ کی بیٹی، کسی شوہر کی بیوی اور کسی بیٹے کی ماں ہے۔ کسی تہذیب میں تو مرد عورت کی تعلیم میں روکاوٹ بنا تو کسی جگہ اسی کی سپورٹ کرنے میں سر فہرست رہا۔ عورت اس معاشرے کا نہایت اہم جزو ہے۔ جس کے بغیر نہ نسلیں چل سکتی ہیں نا قومیں بن سکتی ہیں۔ عورت کے وجود سے ہی زندگی ہے سوال یہ ہے کہ ”عورت آخر چاہتی کیا ہے؟“ عورت عزت چاہتی ہے تحفظ چاہتی ہے۔ عورت تعلیم حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں مرد کے ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کا حقیقی مقام سمجھتے ہوئے جو ایک ماں بھی ہے اور ایک بیٹی بھی وہ بیوی ہے اور بہن بھی و معاشرے کی ترقی میں عورت کے کردار کو سمجھا جائے۔ تعلیم عورت کا بنیادی حق ہے۔ پڑھی لکھی ماں ہی پڑھے لکھے معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔ عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنایا جا سکتا ہے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔

مارچ کی 8 تاریخ خواتین کے عالمی دن کے طور پر منائی جاتی ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے جنت ماں کے قدموں میں رکھ دی ہے تو دوسری طرف آج بھی ہمارے معاشرے میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے عورت کے حقوق پہ بحث کوئی نئی بات نہیں کئی صدیوں سے عورت اپنے حقوق کے حصول کے لیے جہد مسلسل میں ہے۔ وہی حقوق جن کی ادائیگی آج سے 14 سو سال پہلے اسلام کر چکا۔ اسلام جس نے عورت کو عزت و مقام دید۔ ورنہ اسلام کے آغاز سے پہلے عرب میں عورت کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کی پیدائش ایک نحوست سمجھی جاتی تھی۔ عورت کو فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو معاشرہ جو آج بھی عورت کو مکمل حقوق دینے سے قاصر ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورت دوبارہ سے نامل زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی۔ عورت کو ”ستی“ جیسی بے بنیاد اور غیر انسانی رسم کے مطابق زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ مغربی معاشرے کی عورت جو کبھی Feminism کی قائل تھی اب اس معاشرتی آزادی سے تنگ آتی دکھائی دے رہی ہے۔ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں عورت کو ووٹ ڈالنے کی آزادی نہیں تھی کچھ سال قبل عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ عورت جو مغربی معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی ریس میں چلتی چلتی اب تھک چکی ہے۔ اس معاشرے میں جہاں عورت کو مرد کے برابر کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں زندگی کی ساری سہولیات کے حصول کے لیے انسان دن رات کام تو کرتا ہے مگر پیسے اور کام کی اس دوڑ میں کہیں رشتے اور خاندان بہت دور جا چکے ہیں۔ مشرقی معاشرہ جو ایک طرف تو غیرت کے نام پر بہن و بیوی اور بیٹی کا قتل جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اسی معاشرے میں کسی کی بھی بیوی، بہن اور بیٹی سڑک و بس سٹاپ اور گلی بازاروں میں چلتی پھرتی خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ اس کم پڑھے لکھے اور غیر ترقی یافتہ معاشرے میں اگر کوئی لڑکی بس کے انتظار میں ”بس سٹاپ“ پہ کھڑی ہو تو ہر عمر کا مرد اُسے لفٹ دینے کیلئے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں کسی مرد کو اپنی غیرت اور عزت کو محفوظ چاہیے مگر کسی دوسرے کی عزت انہی سڑکوں پہ زسوا کی جاتی ہے۔ آج اکیسویں صدی کے اس نام نہاد مہذب معاشرے میں عورت کی تعلیم اس کے حقوق اور آزادی پہ بات کرنے والوں نے کیا صحیح معنوں میں عورت کو عزت دینے کی کوشش کی؟ عورت کی تعلیم جس کی بات آج مغربی معاشرہ کرتا ہے اس کے بارے میں احکام تو اسلام چودہ سو سال قبل دے چکا ہے۔ نبی کریم کے ارشاد کے مطابق ”علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے“ ایسا پریکٹیکل مذہب جو صدیوں پہلے ہی عورت کے حقوق متعین کر چکا جو عورت کو تعلیم کا حق دے چکا۔ اسی مذہب کے

والدین کی محنت کا احساس کرو گے جب آپ انکے خون پسینے کی کمائی کا احترام کرو گے اور جب آپ کسی امتحان میں ٹاپ کرتے ہو تو آپ کے والدین پھولے نہیں ساتے اور انکی خوشی کی انتہا نہیں۔ رہتی پیارے بچوں آپ ہی پاکستان کا مستقبل ہو آپ نے ہی آگے چل کر پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنی ہے آپ نے ہی صدر بننا ہے آپ نے ہی وزیر اعظم بننا ہے آپ نے ہی سب کچھ سنبھالنا ہے خدا کیلئے والدین کے اعتماد کو مت توڑا کرو جو تمہاری خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں مگر تمہیں افسردہ نہیں دیکھ سکتے پیارے بچوں ہمارا وطن بہت دکھ دیکھ چکا اب آپ سب نے ملکر اسکی تعمیر کرنی اور یہ تعمیر قاید کے فرمان کام اور بس کام سے ممکن۔



بے اور تین ہستیوں کو راضی کرنے سے ممکن ہے اور تین ہستیوں کو خوش کرے سے ممکن ہے اور وہ تین ہستیاں ہیں ماں باپ اور استاد پیارے بچوں محنت کرو سوشل میڈیا سے دور رہو جب تک تعلیم مکمل نہیں کر لیتے غلط لوگوں سے دور رہو اور غلط عادات سے دور رہو اور آپکی زندگی کا مقصد صرف اور صرف تعلیم ہونی چاہیے اور جب تعلیم مکمل کر لوں تو آپکے حقوق ختم اب آپ کے فرائض شروع اور والدین کے حقوق کا آغاز اور اب دیکھنا یہ کہ اپنے والدین کا قرض کس طرح اتارتے ہو یہ زندگی ایک پراسس کا نام ہے۔ کبھی حقوق تو کبھی فرائض اور یہ سب تعلیم سے ممکن ہے پیارے بچوں اللہ پاک آپ سب کو اپنی امان میں رکھے اور آپ سب کو زندگی کے ہر میدان میں کامیاب کرے اور والدین کا اساتذہ کا ادب کرنے کی توفیق دے آمین



میرے وطن کے پھولو ہمیشہ کھلتے رہو

مصنف: سفیان خان

بچے من کے سچے ہوتے ہیں بچے کسی بھی گھر کی رونق ہوتے ہیں بچے ماں کے دل کا گلزار اور باپ کے جگر کا گلزار ہوتے ہیں بچے ہی تو کسی بھی ریاست کا مستقبل ہوتے ہیں۔ بچے ہی گھر کی خوشی ہوتے ہیں پیارے بچوں آپ کو کتنے لاڈ و پیار سے پالا جاتا ہے آپ کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے آپ کے دکھ سکھ کا خیال رکھا جاتا ہے اور کس طرح آپ کو صبح آپکی ماں آپ کو تیار کر کے سکول بھیجتی ہے

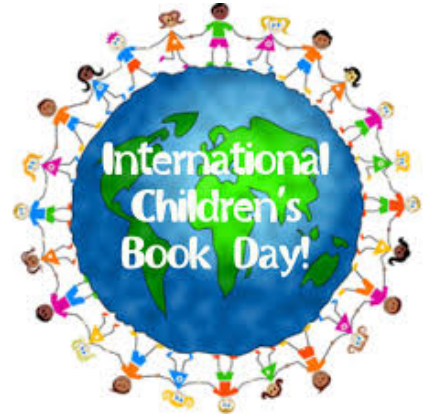


اور کس آپکا باپ آپکی تمام ضروریات پوری کرنے کیلئے دنیا میں۔ مسائل سے لڑ جاتا ہے ہر ماں اور باپ چاہتا ہے کہ اسکے بچے پوری دنیا سے اوپر ہوں اور آپکے تمام حقوق آپ کو دیے جاتے ہیں اور پاکستان آپکے مفت تعلیم اور صحت کی سہولتیں مہیا کرتا ہے سب کے والدین امیر اور جاگیردار نہیں ہوتے سب کے والدین تاجر اور صنعت کار نہیں ہوتے کسی کا باپ مزدور یوتا ہے تو کسی کا باپ مسزگی کسی کا باپ کا شکار ہوتا ہے تو کسی کا باپ ڈراپور کسی کا باپ سارا دن پھیری کا کام کرتا ہے تو کسی کا باپ درزی اور کسی کی ماں گھروں میں کام کرتی ہے تو کسی کی کام مزدوری پر کپڑے سیتی ہے مگر پیارے بچوں آپکو ہر سہولت میسر ہوتی ہے اور افسوس اس وقت والدین کو لگتا ہے ریاست کو لگتا ہے جب آپ کسی بھی امتحان میں فیل ہو جاتے ہو اور آپکا فیل ہونا والدین کی خوشیوں کا قتل ہو تاہے اور والدین اس وقت ٹوٹ جاتے ہیں جب آپ کسی غلط صحبت میں چلے جاتے ہو اور چرس سگریٹ اور دوسری غلط عادات کو اپنا لیتے ہو اور والدین کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہو اور انکی محنت کو برباد کر دیتے ہو اور ان کو جیتے جی مار دیتے ہو جنھوں نے آپ کو ہر سہولت دی اور اپنے انکی محنت پر پانی پھیر دیا پیارے بچوں کامیابی اس وقت ملتی ہے جب آپ اپنے

انٹرنیشنل چلڈرن بک ڈے!

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

مجھے نہیں معلوم کہ بچوں کی کتابوں کے عالمی دن کو ہمارے پاکستان میں دھوم دھام سے کیوں نہیں منایا جاتا، پاکستان میں بچوں کی کتابوں کا عالمی دن ہمیشہ خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ ہم نے بہت سے دوستوں کو فون کیا جن کا تعلق سکول سے تھا کہ وہ اس دن بچوں کے لیے کتابوں کا سال لگائیں، لیکن تقریباً سبھی نے اسے فضول سمجھا اور بعض نے تو مذاق تک اڑایا۔ لیکن ایک بات سب میں مشترک تھی اس دن سے لاعلمی۔ ہمارے علم میں آیا اور ہم حیران ہوئے کہ پاکستان میں کبھی یہ دن منایا گیا ہو اس بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے علم و تحقیق کا دامن چھوڑ دیا، وہ پستی میں گر گئی۔ دوسری طرف ہم بہت سے مغربی دن بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں، جن کی بے شک اسلام میں اجازت بھی نہ، معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہو مثلاً ویلنٹائن ڈے پر اس سال بہت خوب لکھا گیا پروگرام کیے گئے۔ مجال ہے جو بچوں کی کتابوں کے حوالے سے ایسے دھواں دار پروگرام ہوتے ہوں۔ ہم ایسے دن منانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں جن سے قوم کا بھلا ہوتا ہو۔

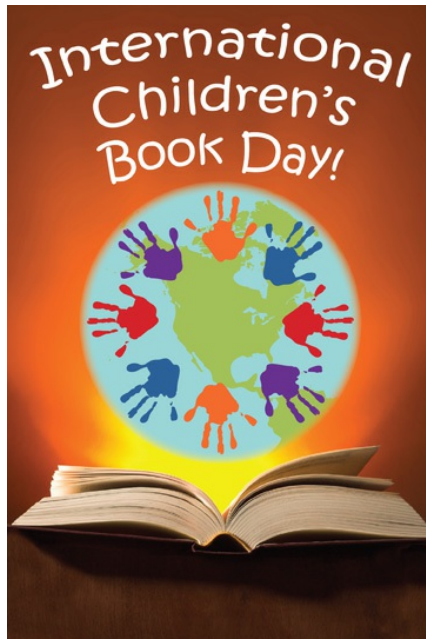


جس سے وہی کلچر پروان چڑھتا ہے۔ بد قسمتی دیکھیں ہم بچوں کے لیے (روشن مستقبل کے لیے) اب تک کوئی اصلاحی چینل شروع نہ کر سکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اپنے مستقبل کو کتنی اہمیت دے رہے ہیں اور ہمیں اپنے کلچر، ملک، اسلام، زبان سے کتنی محبت ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کا موازنہ ہمسایہ ملک سے کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اتنا بڑا نیٹ ورک، میڈیا کھڑا کر دیا ہے کہ اس کی مثال دینا مشکل ہے۔ اب وہ اپنا کلچر، زبان، مذہب بذریعہ کارٹون، فلمیں ہمارے بچوں کو سکھا رہے ہیں۔

بچوں کی کتابوں کے عالمی دن کو منانے کا مقصد بچوں میں کتب کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا ہے۔ ان کی تعلیم

و تربیت کے لیے کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے اگرچہ آج ٹی وی انٹرنیٹ اور موبائل نے بچوں کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا ہے، لیکن کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

یہ تو ہم جب بچے تھے تب سے سن رہے ہیں کہ بچے قوم کی امانت ہیں، اور ملک کے روشن مستقبل کی ضمانت ہوتے ہیں، لیکن ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یعنی روشن مستقبل کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے بچوں کے لیے کیا بہت سا کتابوں کا سرمایہ جمع کر لیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ماضی میں شائع ہونے والی بچوں کی کتابوں کو بھی دوبارہ شائع نہیں کیا۔ دکھ کی بات یہ بھی ہے کہ اب ہمارے بچے ہندی کارٹون، فلمیں وغیرہ دیکھتے ہیں۔



پاکستان میں بہت سے ماہنامہ، پندرہ روزہ، ہفت روزہ رسائل و میگزین بچوں کے لیے شائع ہوتے ہیں اسی طرح تقریباً ہر اخبار بھی ہفتے میں ایک دن بچوں کے لیے ایک صفحہ یا میگزین شائع کرتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی تعداد اشاعت بھی قابل ذکر ہے۔ اکثر ایسے ہیں جن میں بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن بچوں کو زیادہ تر فرضی کہانیاں سنائی جاتی ہیں جن میں حقیقت کا عمل دخل بہت کم ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا بچوں کو تاریخ، اسلام، سائنس دانوں کی زندگی وغیرہ پر زیادہ مواد دیا جاتا۔ پاکستان میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتب کی تعداد دشرم ناک حد تک کم ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اچھے لکھاریوں کا کم ہونا۔ قاری کم ہیں۔ کتاب شائع کرنے کے لیے سرمایہ کا نہ ہونا۔ بچوں کے ادب کو اہمیت نہ دینا وغیرہ پاکستان میں بچوں کے لیے جو میگزین و رسائل شائع ہو رہے ہیں ان میں سے چند قابل ذکر درج ذیل ہیں۔

موجودہ دور میں بڑھتے نفسیاتی مسائل سے بچنے کے لیے آج

ماہرینِ نفسیات بچوں کے لیے مطالعہ کو لازمی قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے بچے زیادہ تر ماحول سے بھرپور گیم دیکھ رہے ہیں یا کارٹون جن سے تشدد کو پسند کرنے لگتے ہیں اس لیے کتابوں کی طرف بچوں کو راغب کیا جانا ضروری ہے، گیم، کارٹون کی موجودگی میں بچوں کو مطالعہ کی طرف راغب کرنا کٹھن کام ہے۔ اس کا حل یہ بھی ہے کہ بچوں کے لیے ایک چینل ہو جس میں بچوں کو سچی کہانیاں، مزاحیہ کارٹون، ہمارے کلچر، زبان، مذہب کی تبلیغ کی جائے۔ اس کے باوجود کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اچھی کتابیں شعور کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بہت سے فضول مشغلوں سے بھی بچاتی ہیں۔ بچوں میں مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں والدین اور اساتذہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہمارے لکھاریوں کو بھی اس بارے میں لکھنا چاہیے۔ جتنے بڑے لکھاری ہیں، ان میں سے اکثر پہلے بچوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔

مثلاً نظیر اکبر آبادی کواردو ادب کا اولین عوامی شاعر کہا جاتا ہے، جنہوں نے بچوں کے ادب پر بہت ساری اہم نظمیں لکھیں۔ ان کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد، امتیاز علی تاج، اسماعیل میرٹھی، حفیظ جالندھری، کرشن چندر، شوکت قتلوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، احمد ندیم قاسمی، ڈپٹی نظیر احمد، شبلی نعمانی، حجاب امتیاز علی، علامہ اقبال، حالی، عصمت چغتائی، قتیل شفائی، قصیر تمکین، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، انوار صدیقی، ڈاکٹر شکیل الرحمن، علی ناصر زیدی، غلام مصطفیٰ، صوفی تبسم، ماہر القادری، عبدالحمید نظامی، تنویر پھول، ڈاکٹر اسلم فرخی، اشتیاق احمد، نذیر انبالوی، ذکیہ بلگرامی، ناصر زیدی وغیرہ میں نے خود ایک عرصہ تک بچوں کے لیے لکھا ہے۔ اب بھی کبھی کبھار بچوں کے لیے کچھ ناپکھ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہم نے اپنے والدین سے، دادا جی سے بچپن میں بہت سی کہانیاں سنیں وہ اب تک یاد ہیں، ہر کہانی کی ابتدا ایک تھا بادشاہ۔ سے ہوتی اور اختتام ان الفاظ پر۔۔ اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ آج بھی یہ الفاظ اپنے اندر محبت لیے میرے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ عصر حاضر میں بچوں کے ادب پر بہت کم لکھا جا رہا ہے دور حاضر میں کمپیوٹر ٹکنالوجی اور مختلف گیمز نے بچوں کو مشغول کر رکھا ہے ایسے میں والدین کا فرائض ہونا چاہئے کہ اپنی اولاد کو کتابوں سے روشناس کروائیں۔

آج والدین اپنے بچوں کو آئس کریم یا برگر کے لیے تو بخوشی پیسے دے دیتے ہیں لیکن وہ اپنے بچوں کو کتاب خرید کر بطور تحفہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اب نئے لکھاریوں میں سے بہت کم ہیں جو بچوں کے لیے لکھتے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کے لیے لکھنے والے اب انتہائی بوڑھے ہو گئے ہیں، وہ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ اب ان کے لیے بچوں کے لیے لکھنا مشکل نہیں ہے۔ حالانکہ بچوں کے لیے لکھنا مشکل ترین کام ہے، بعض خود کو بڑا لکھاری سمجھنے والے بچوں کے لیے نہیں لکھتے

مطلب مشکل کام نہیں کرتے اور اس لیے بھی کہ بچوں کے لیے لکھنا ان کی نظر میں اہم نہیں ہے۔ جہاں تک بچوں کے ادب کا، کتابوں کا تعلق ہے تو حالت تشویشناک ہے۔

بچوں کی کتابوں کا عالمی دن بہت سے ممالک میں منایا جاتا ہے۔ یہ دن سب سے پہلے IBBY کی طرف سے تجویز کیا گیا۔ اور 2 اپریل کو انٹرنیشنل چلڈرن بک ڈے (ICBD) بچوں کی کتابوں کا عالمی دن غالباً 1967ء کو پہلی مرتبہ منایا گیا۔ اس دن دنیا میں بچوں کی کتابوں کے سٹال لگائے جاتے ہیں، بچوں کا ادب لکھنے والوں کو سراہا جاتا ہے، ایوارڈ وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان میں ایسا کچھ نہیں کیا جاتا۔ اس بارے میں ہماری والدین، اساتذہ، صحافیوں، لایبوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کریں۔ تاکہ ہم اپنے ملک و قوم کے مستقبل کی بہتر پرورش کر سکیں۔ گذشتہ سالوں کی نسبت پاکستان میں بچوں کے لیے کتب کی اشاعت اور خریداری میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ گزشتہ سال ایک طرف یہ بحث جاری تھی کہ پاکستان میں کتب بنی کا شوق ماند پڑتا جا رہا ہے اور ہر فورم پر اس پر مذاکرے دیکھنے میں آتے تھے وہاں خصوصاً بچوں کے لیے کتب کی اشاعت خوش آئندہ بات ہے۔

پاکستان میں ہونے والے کتب میلوں، کانفرنسوں جیسا کہ اردو کانفرنس، انجرا کانفرنس، کاروان ادب کانفرنس وغیرہ کے انعقاد نے لوگوں کو کتب بنی کی جانب راغب کیا۔ ان کتب میلوں میں لوگ فیملی ممبران کے ساتھ جوق در جوق شرکت کر رہے ہیں، یہ ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارے اشاعتی اداروں کو اب ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ وہ معیاری کتب کے ساتھ ساتھ سستی کتابوں کو شائع کریں، اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری نسل مایوس ہو کر دوبارہ گلوبل ویلج کی چکا چوند میں کہیں گم ہو جائے گی اور اسے ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔

§§§

بہتر گھر

مصنف: علی احمد

ایک شخص نے بہتر گھر خریدنے کیلئے اپنا پہلا والا گھر بیچنا چاہا۔
اس مقصد کیلئے وہ اپنے ایک ایسے دوست کے پاس گیا جو جائیداد کی خرید و فروخت میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔
اس شخص نے اپنے دوست کو مدعا سنانے کے بعد کہا کہ وہ اس کے لئے گھر برائے فروخت کا ایک اشتہار لکھ دے۔
اس کا دوست اس گھر کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اشتہار کی تحریر میں اس نے گھر کے محل وقوع، رقبے، ڈیزائن، تعمیراتی مواد، باغیچے، سونگ پول سمیت ہر خوبی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔
اعلان مکمل ہونے پر اس نے اپنے دوست کو یہ اشتہار پڑھ کر سنایا تاکہ تحریر پر اسکی رائے لے سکے۔
... اشتہار کی تحریر سن کر اس شخص نے کہا، برائے مہربانی اس اشتہار کو ذرا دوبارہ پڑھنا۔ اور اس کے دوست نے اشتہار دوبارہ پڑھ کر سنا دیا۔
اشتہار کی تحریر کو دوبارہ سن کر یہ شخص تقریباً چیخ ہی پڑا کہ کیا میں ایسے شاندار گھر میں رہتا ہوں؟
اور میں ساری زندگی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھتا رہا جس میں کچھ ایسی ہی خوبیاں ہوں۔ مگر یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں تو رہی ہی ایسے گھر میں رہا ہوں جس کی ایسی خوبیاں تم بیان کر رہے ہو۔ مہربانی کر کے اس اشتہار کو ضائع کر دو، میرا گھر بکاؤ ہی نہیں ہے۔
ایک بہت پرانی کہات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کو ایک کانڈ پر لکھنا شروع کر دو، یقیناً اس لکھائی کے بعد تمہاری زندگی اور زیادہ خوش و خرم ہو جائے گی۔
اصل میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہی بھلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ جو کچھ برکتیں اور نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں ہم ان کو گننا ہی نہیں چاہتے۔

ہم تو صرف اپنی گئی جتنی چند پریشانیاں یا کمی اور کوتاہیاں دیکھتے ہیں اور برکتوں اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔
کسی نے کہا: ہم شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے پھولوں کے نیچے کانٹے لگا دیئے ہیں۔ ہونا یوں چلیئے تھا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے کانٹوں کے اوپر بھی پھول اگا دیئے ہیں۔
ایک اور نے کہا: میں اپنے ننگے پیروں کو دیکھ کر کڑھتا رہا، پھر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو شکر کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔
اب آپ سے سوال

کتنے ایسے لوگ ہیں جو آپ جیسا گھر، گاڑی، ٹیلیفون، تعلیمی سند، نوکری وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جب آپ اپنی گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے ہو تو وہ سڑک پر ننگے پاؤں یا پیدل جا رہے ہوتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی جب آپ اپنے گھر میں محفوظ آرام سے سو رہے ہوتے ہیں؟
کتنے ایسے لوگ ہیں جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نا کر سکے اور تمہارے پاس تعلیم کی سند موجود ہے؟
کتنے بے روزگار شخص ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور آپ کے پاس ملازمت اور منصب موجود ہے؟
اور وغیرہ وغیرہ ہزاروں باتیں لکھی اور کہی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔

کیا خیال ہے ابھی بھی اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور انکا شکر ادا کرنے کا وقت نہیں آیا کہ ہم کہہ دیں
یا رب لک الحمد کا مینہ لجلال و جہک و عظیم سلطانک
اللہم لک الحمد حتی ترضی و لک الحمد اذا رضیت و لک الحمد بعد الرضا

ہائے میرا بچپن!!!!

مصنف: سفیان خان

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان بچپن کی طرف بڑھتا جاتا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تو ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے مگر چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کی علیحدہ کہانی ہو گی۔ آج سے تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا دیے گئے تھے۔



ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر سات آٹھ سال ہوگی۔ جب ایک دن صبح دلاوی جان نے ہمیں چوٹی (آج کے بچوں کو کیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ چوٹی ایک روپے کا چوٹائی یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں) دی کہ سامنے والے کھوکھے سے انڈے لے آؤ۔ ہماری ہانچیں کھل انھیں اور اپنے پچھلے دن کے بارے میں سوچنے لگے کہ دلاوی کی اس خاص مہربانی ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweet egg کا ڈبہ (یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل کی گولیاں جو ایک موبائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی تھیں۔ اس ڈبے پر چھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہلانے پر میٹھے انڈے پھٹتی پر گرتے تو بس..... کیا مصیبت ہے! بچپن کا حال لکھیں تو ہر چیز explain کر کے بتائیں کہ آج وہ چیزیں ہی ناپید ہو گئیں) بھاگ کر لائے اور لان میں بی بیٹھ کر کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی آپک لے اور خواہ مخواہ بھوار کرنا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد دونوں ہی خطرناک تھے اس معاملے میں! ڈبہ ختم کر کے جب اندر آئے تو دلاوی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا پوچھا تو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیچاری آلیٹ کے لئے پیاز کاٹ کر منتظر تھیں کہ ہمارے آنے پر ناشتے کا انتظام ہو! جی نہیں! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا

لطیفہ بنانا اس وقت تو دلچسپ لگ رہا ہے مگر اُس عمر میں تو رو رو کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنا یا جاتا۔ جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہانیاں سننا بہت پسند تھا۔ دلاوی جان سال کا آدھا حصہ ہمارے گھر اور بقیہ آدھا بڑے ابا کے گھر حیدر آباد میں گزارتی تھیں۔ بچوں اور بوڑھوں کی دوستی تو ویسے بھی ضرب المثل ہے کیونکہ ان دونوں اقوام کو ہی اصول و قواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے ہیں اور جو 'لوگ کیا کہیں گے!' کے بجائے 'جہاں اور جیسا ہے' کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی دلاوی جان کا انتظار ان کے جاتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چونکہ پڑھنے اور خصوصاً کہانیاں پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ اسلئے موسم اور حالات کی پرواہ کئے بغیر دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔ اس چکر میں بعض انہونی نہ ہو سکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں پھرنے سے بچے۔

نیک پر یوں کی کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ ہم عام زندگی میں بھی کہانیوں کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران امی کو ستا رہے ہیں۔ کبھی بات نہ مان کر تو کبھی شرارتوں میں! محلے والوں کی شکایتیں سن کر امی بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق! نہ وسائل نہ طاقت! ہاں مگر ایک ہتھیار تھا! قلم کی قوت! کسی پری کی طرف سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعقول حرکت کی ہو۔ مدعا یہ ہوتا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حرکت کی ہے لہذا تمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا..... اب آپ خود سوچیں ایک بری سی پیڈ رائٹنگ میں بچکانہ اسٹائل میں کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی؟ اس وقت آپ سے یہ شیر کرنا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شرمندگی لگتی تھی حالانکہ یہ تذکرہ ہماری تعریف میں ہی ہوتا تھا۔ بذریعہ قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی تھے۔ ہاں شعوری طور پر جب اس کا آغاز کیا تو ظاہر ہے اس کی بنیاد کوئی مہر بان، نیک پری نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہو گئی۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آتا ہے اس وقت کا ہے جب ہم جماعت سوم میں پڑھتے تھے۔ ہماری آرٹ ٹیچر نے اعلان کیا کہ آئندہ وہ ہمیں واٹر کالر سکھائیں گی۔ ہر بچے کی طرح ہمیں بھی ڈرائنگ سے بڑا شغف تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوش بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے منگوائی تھی۔ پینٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گھولنے کے لئے پلاسٹک کے پیالے، اسپرن اور فالٹو کپڑے وغیرہ آج تو اس میں سے کوئی بھی چیز پینٹ سے باہر نظر نہیں

آ رہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ذرا آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سوچیں! اور صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور! جہاں آج کل بڑے بڑے شاہنگ سنٹرز، دفاتر اور تعلیمی ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کر تا تھا سڑک کے دونوں جانب! نزدیک ترین شاہنگ سینٹر صدر ہوا کر تا تھا جہاں صرف اسٹاف بس کے ذریعے جایا جاسکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی چلا کرتی تھی۔ امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سامان لانے روانہ ہو گئیں۔

اس سامان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔ خوشی بھرا اضطراب! جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کپڑے اور جوتے سامنے رکھ کر! جب مطلوبہ پیڑز شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ تقریباً پچیس بچوں اور بچیوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا سامان لے کر آئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکائے کھڑے تھے۔ ٹیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی میز پر بلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں۔ جس وقت وہ ہم پر تعریف کے ڈونگے برس رہی تھیں اسی وقت پر نپل بھی کابیزور سے گزریں۔ ٹیچر نے انہیں بتایا تو وہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں تھا۔ یوں تو اپنی تعریف ہر ایک کو پسند ہوتی ہے مگر اس طرح نمایاں ہونے میں انسان کتنا تنہا ہوتا ہے!!! کیا خیال ہے؟ شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنی امی سے شکایت کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں ملتا کہ دینے آپ نے..... اور جناب ہمارے سامنے ہی اسکی بڑی بہن نے اس کے کان بیٹھے یہ کہہ کر ”تم خود کتنے خراب لڑکے ہو! تمہیں کچھ آتا بھی ہے! اس کو دیکھو کتنی اچھی پٹی ہے.....“ یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے دے دوں! اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں نہیں ہیں مگر اب سوچتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری امی نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ مہیا کیں؟؟ آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت تو یقیناً امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہو گا!

اس واقعے کا ڈراما سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پا کر تمام رنگ خراب کر دیے۔

اسکول سے واپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو رونا شروع کیا وہ کئی دنوں بعد ہی ختم ہو سکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب چھین جائے تو دایلا کرتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں مجھ کو کا شکریہ! یہ کیا بات ہوئی ہے تو انسان کو تکلیف دینے والا شش پایہ ہے جو احسان کا جواب بھی ڈنک مار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں؟؟

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اپنے اسکول جایا کرتے تھے۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پر ہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہر گز نہیں تھے۔

تو جناب! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتایا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔ اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جاکر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کرتی تھی اسج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو! بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کرتی تھی۔ شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہوتا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کا اہتمام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل لپا یا اور نہ جانے کس طرح امی سے اجازت اور ٹکٹ کے پیسے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتر وایا گیا تو وہاں بچھو صاحب آرام فرما رہے تھے اور ہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں! ہمیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ دی گئی۔ تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے اس کا شکریہ درست ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصومیت کو دغا دار ہونے سے بچایا بلکہ سنت کے مطابق چیزوں کو جھاڑ کر استعمال کرنے کی عادت ڈلوائی

میرا خیال ہے کہ بچپن نمبر کے لئے اتنے ہی واقعات بہت ہیں! ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے! کیسا لگا یہ دور؟؟

